نفاذ شریعت اور
دور جدید کا مسلمان معاشرہ

تبصرہ نگار | خورشید احمد ندیم

جناب ارشاد احمد حقانی کی کتاب
''دین وسیاست'' کا ایک مطالعہ

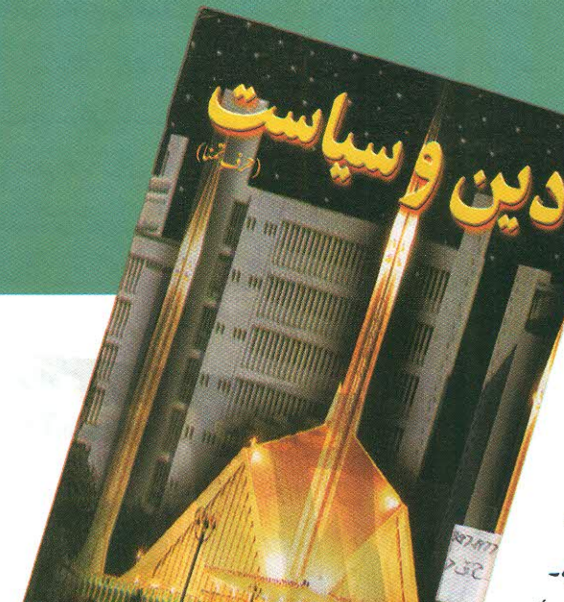

جناب ارشاد احمد حقانی پاکستان کے ان ممتاز اہل صحافت میں بھی ممتاز تر ہیں جو مذہب، تاریخ اور سماجی علوم کا ایک واضح پس منظر رکھتے ہیں اور ان کا ایک نظامِ فکر (Worldview) ہے جس کا اظہار ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ محترم ارشاد حقانی نوجوانی میں جماعت اسلامی سے وابستہ رہے اور اس کے سہ روزہ اخبار ''تسنیم'' کے مدیر بھی رہے۔ جماعت اسلامی، ہمیں معلوم ہے کہ ایک مخصوص تصور دین کی اساس پر قائم ہوئی جو اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کیا۔ حقانی صاحب ابتدا میں اسی تصور دین کے مؤید رہے لیکن بعد میں ہر سوچنے سمجھنے والے صاحب علم کی طرف وہ اپنے خیالات پر نظر ثانی بھی کرتے رہے۔ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد، انہوں نے جو کچھ لکھا، اس سے فکر کا وہ ارتقا نمایاں ہے جو ان کے ہاں فہم دین کے باب میں واقع ہوا۔ یہ بات اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۸۰ء میں وہ فکری ارتقا کے جس مرحلے میں تھے، اس میں بڑی حد تک ایک ٹھہراؤ ہے اور کم وبیش تین دہائیاں قبل ان کی تحریروں میں فکری پختگی کے جو مظاہر سامنے آئے، ان کی جھلک آج کل کے مضامین اور کالموں میں بھی موجود ہے۔

''دین وسیاست'' ان کے بعض ایسے کالموں کا مجموعہ ہے جو روزنامہ ''جنگ'' میں ۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۹ء کے عرصے میں لکھے گئے۔ عنوان سے واضح ہے کہ ان کالموں میں اسلام، شریعت، نفاذ اسلام اور اسلامائزیشن جیسے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ اخباری کالم، روزمرہ واقعات سے جنم لیتا اور ان سے مربوط ہوتا ہے، تاہم لکھنے والا اگر ایک فکری نظام (Worldview) رکھتا ہو تو وہ انہیں ایک عالمگیر اور وسیع تر سلسلۂ واقعات کے تناظر میں دیکھتا ہے جس کی بنیاد اس کے فہم دین، تصور تاریخ اور مطالعۂ سماجی علوم میں ہوتی ہے۔

ہماری اپنی تاریخ میں اس کی ایک مثال مولانا مودودی کی وہ تحریریں ہیں جو ''تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان'' کے عنوان سے دو جلدوں میں مرتب کر دی گئی ہیں۔ ان مضامین نے ان حالات سے جنم لیا، جن سے برصغیر کے مسلمان ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائی میں دوچار تھے۔ یہی سبب ہے کہ یہ مضامین سب سے پہلے ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ''موجودہ'' کا تصور بھی بدل گیا لیکن چونکہ ان واقعات کو ایک صاحب قلم نے اپنے مربوط نظام فکر کے تحت دیکھا، اس لیے اختلاف یا اتفاق سے قطع نظر، ان کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ ''دین وسیاست'' میں شامل بعض مضامین کے شان نزول کے طور پر پندرھویں آئینی ترمیم کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن کالم نگار نے چونکہ اس کا جائزہ اپنے نظام فکر کے تحت لیا ہے، اس لیے ان کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔

''دین وسیاست''' میں جناب ارشاد احمد حقانی نے نفاذ شریعت کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں اس عمل سے وہ کیا مراد لیتے ہیں۔ اسے دو نکات کی صورت میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

۱-سماجی ومعاشی سطح پر عدل اجتماعی کا قیام

۲-جمہوری تصورات اور اقدار کی بنیاد پر سیاسی نظام کی تشکیل

ان مضامین میں ان دونوں باتوں کو مختلف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر یہ حوالہ دیکھیے: ''اگر آپ ایک عام مسلمان شہری سے یہ دریافت کریں کہ نفاذ شریعت کے سب سے پہلے جو اثرات مرتب ہونے چاہئیں، ان کے بارے میں تمہارے ذہن میں کیا تصور ہے تو وہ بلا تامل جواب دے گا کہ پاکستان میں انصاف (عدل) کا دور دورہ ہونا چاہئے۔ انصاف یا عدل کے الفاظ وسیع مفہوم رکھتے ہیں لیکن نمایاں ترین مفہوم اس اصطلاح کا یہ ہے کہ معاشرے سے ظلم اور استحصال کم ہوجائے یا ختم ہوجائے اور عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ عدل قانونی بھی ہو، معاشرتی بھی ہو اور معاشی بھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشی عدل ہی معاشرتی اور سماجی عدل کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اگر معاشرے میں معاشی انصاف ہو تو معاشرتی عدل کے امکانات خود بخود روشن ہوجاتے ہیں۔ اسلام میں معاشی عدل کا تصور کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اسلام تمام افراد معاشرہ اور تمام طبقات معاشرہ میں کلی اور سوفیصدی یکساں مساوات کی تعلیم نہیں دیتا اور خود کہتا ہے کہ مال کے معاملے میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہوتی ہے لیکن تعلیمات اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کسی شک وشبہے کے بغیر واضح ہوتی ہے کہ اسلام کا مقصد معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کو ہر ممکن حد تک کم کرنا ہے۔ اسلام میں ساری تعلیم ہی یہی ہے کہ اسلام کا مقصد معاشی اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے۔ اس کے لیے وہ اخلاقی تعلیمات بھی دیتا ہے، ترغیب بھی دلاتا ہے، کچھ قواعد وضوابط بھی مقرر کرتا ہے اور اس ضمن میں فرد کے علاوہ وہ ریاست کی کچھ ذمہ داریاں بھی متعین کرتا ہے'' (صفحہ ۸۵)۔

حقانی صاحب کے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے کہ جو حکومت یا ادارہ نفاذ اسلام کا علمبردار ہے، اس کا اپنا فہم اسلام کیا ہے۔ انہوں نے لکھا: ''اسلام کے حوالے سے سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ جس ادارے کو نفاذ اسلام کا اختیار دیا جائے، اس کا فہم اسلام انقلابی ہو اور سیاسی، معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور دوسرے متعدد دائروں میں رجعت پسندانہ نہ ہو۔ یہ سب سے بنیادی تقاضا ہے جو کسی بھی قسم کی اسلامائزیشن سے درست نتائج حاصل کرنے کے لیے درکار ہے''۔ (صفحہ ۴۲)

جنرل ضیاء الحق مرحوم نے نفاذ اسلام کا جو تجربہ کیا، اس کی ناکامی کے وہ کئی اسباب بیان کرتے ہیں لیکن ان میں نمایاں تر مرحوم کا فہم دین تھا۔ اس حوالے سے وہ ایئر مارشل اصغر خان کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق کا فہم دین ایک دیہاتی قصبے کے امام مسجد سے زیادہ نہیں تھا۔ اسی طرح جب ۱۹۹۸ء میں پندرھویں آئینی ترمیم کے تحت نفاذ شریعت کے لیے ایک اقدام کیا جارہا تھا تو اس کے نتائج کے بارے میں وہ زیادہ پرامید نہیں تھے کیونکہ اس کام کے لیے جو حلقے حکومت کی تائید کررہے تھے یا جن کو متحرک کیا جاتا تھا، ان کا فہم اسلام طالبان کے فہم اسلام سے مختلف نہیں تھا اور اس وقت کی حکومت بھی اسلام کی کسی انقلابی تعبیر کی موید نہیں تھی۔

سوال یہ ہے کہ خود کالم نگار کے نزدیک شریعت کی انقلابی تعبیر کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

''(اسلام) محروم اور افتادگان خاک اور مستضعفین کو ابھارنے والا مذہب ہے

اور وہ ان کی دوسروں کے مقابلے میں پسماندہ حالت کو تبدیل کرنے کا علمبردار ہے۔ وہ فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت جو جبر اور استحصال کی تین علامتیں ہیں، ان کو مٹانا چاہتا ہے، ان کی نفی کرنا چاہتا ہے، اور انسان اور مسلمان کو ان تمام بندھنوں اور غلامیوں سے آزاد کرانا چاہتا ہے، جن میں وہ جکڑ دیے گئے ہیں، اسلام ایک نجات دہندہ (emancipating force) ہے''۔ (صفحہ ۸۷)

اپنے کالموں میں حقانی صاحب نے اس فہم اسلام کے جو خدوخال بیان کیے ہیں، انہیں عرف عام میں انقلابی ہی قرار دیا جائے گا۔ زکوۃ، انفاق فی سبیل اللہ اور انفاق بالعفو کی جو تفصیل انہوں نے کی ہے، سچ یہ ہے کہ ہمارے کسی مذہبی طبقے یا جماعت نے ان امور کو اس طرح بیان نہیں کیا جو ملک میں نفاذ اسلام کے علمبردار ہیں۔ بعض پر شاید اس کی اہمیت اس طرح واضح نہیں اور بعض کی تعبیر دین میں شاید اس کی گنجائش نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ زکوۃ اور عشر کے جو مصارف قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں، ان کے مفہوم پر دوبارہ غور کیا جائے۔ اسی طرح تملیک شخصی کی جو شرط فقہا سختی سے عائد کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کا تعین کیا جائے۔ ہماری دانست میں نہ صرف ''فی سبیل اللہ'' کی مد کے مفہوم پر علمی غور وخوض کیا جانا

چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کی تعریف میں صرف وہ چند مصارف آتے ہیں جو فقہا نے بیان کیے ہیں یا ان کا دائرہ وسیع تر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ''مؤلفۃ القلوب'' کے مفہوم کو حالات حاضرہ کے سیاق وسباق میں از سر نو سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے حکومت کے منصوبہ بندی کے ایک ممتاز ترین ماہر نے راقم سے گفتگو کرتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا کہ اگر عشر سے حاصل ہونے والی خطیر رقم کو دیہی آبادی کی اجتماعی بہبود کے کاموں میں بالخصوص دیہات میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی پر صرف کرنے کی گنجائش نکل سکے تو اس سے ملک کی انتہائی بدقسمت اور محروم آبادی کی زندگی میں ایک انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تملیک شخصی کی شرط پر سختی سے اصرار قائم رہا تو اندیشہ ہے کہ اربوں روپے کی اس رقم کی تقسیم کے لیے یا تو غریب افراد باقی رکھنا پڑیں گے یا اس رقم کا استعمال مشکل ہو جائے گا اور یہ عجیب صورت ہو گی کہ اسلام کا ایک مفید حکم محض ایک فقہی پابندی کی وجہ سے دور حاضر میں اپنی پوری افادیت ثابت کرنے سے قاصر رہے''۔ (صفحہ ۴۷)

حقانی صاحب کے نزدیک ''اگر نفاذ اسلام کے عمل پر لوگوں کی غالب اکثریت کو مطمئن کرنا مقصود ہے تو یہ احساس عام ہونا چاہیے کہ قومی وسائل پر تمام افرادِ معاشرہ کا حق ہے''۔ (صفحہ ۴۸)

حقانی صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلام انفرادی ملکیت کا حق قطعی طور پر تسلیم کرتا ہے اور حصول دولت کو جائز قرار دیتا ہے تاہم ''جب اور جہاں انفرادی اور اجتماعی مصالح میں تصادم ہو تو اس کا وزن اجتماعی مصالح کے پلڑے میں پڑتا ہے۔ اسلام میں یہ بات ناقابل تصور ہے کہ کچھ افراد معاشرہ عسرت وتنگ دستی اور دست نگری کی حالت میں رہیں جب کہ کچھ دوسرے افراد خوش حالی اور فراخی سے بہرہ ور بلکہ اسراف وتبذیر کے مرتکب ہوں''۔ (صفحہ ۴۳، ۴۴)

وہ اس بات کو بھی جائز سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت بوقت ضرورت لوگوں سے ان کا زائد مال لے سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے بعض مذہبی حلقوں نے سوشلزم کے فلسفے کا توڑ کرنے کے لیے نجی ملکیت کے تصور پر اس قدر زور دیا ہے کہ یہ پہلو آنکھوں سے بالکل ہی اوجھل ہو گیا کہ اگر معاشرے کی ضروریات تقاضا کریں تو اسلامی حکومت قانوناً بھی ان کا زائد مال حاصل کر سکتی ہے .... ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ عشر صرف زرعی پیداوار پر واجب الادا ہے حالانکہ صنعتی پیداوار بھی اس کے زمرے میں آتی ہے''۔ (صفحہ ۹۵)

وہ ترمذی کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہوئے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ ''اگر معاشرے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مالداروں سے زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ بھی کچھ لینا ضروری ہو تو اسلام کی اس اجازت دیتا ہے''۔ ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں ''ریاست کفالت عامہ کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اگر زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ بھی لوگوں سے مال لینا چاہے تو وہ ایسا کرنے کی مجاز ہے بلکہ بعض علماء کے نزدیک وہ صرف مجاز ہی نہیں بلکہ مکلّف بھی ہے اور کوئی مسلمان زکوٰۃ کے علاوہ اپنے فاضل مال ودولت حکومت کے حوالے کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

سورہ بقرہ میں ایک جگہ ارشاد ہے: ''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا یا کتنا (مال) اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ کہہ دیجیے کہ جو فالتو ہو'' (۲: ۲۱۹)۔ فالتو کے لیے قرآن نے ''العفو'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے مفہوم میں ہمارے ہاں اختلاف ہے۔ حقانی صاحب اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ جو سرمایہ یا وسیلہ رزق بے کار پڑا ہو اور معاشرے کی دولت میں اضافہ نہ کر رہا ہو وہ العفو ہے۔ دوسرا یہ کہ فالتو مال اللہ کی راہ میں دینا اختیاری نہیں لازمی ہے اور ریاست اسے حاصل کرنے کی مجاز ہے۔ تیسرا یہ کہ فالتو مال زکوٰۃ کی ادائیگی کے باجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور ریاست کے حوالے کرنا ایک شرعی تقاضا ہے اور اس میں صاحب مال کے اختیار کا کوئی دخل نہیں'' (صفحہ ۹۵)۔ وہ اپنی تائید میں سورہ آل عمران کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ ''اے نبی لوگوں سے ضرورت سے زیادہ مال ودولت لے لو اور معروف کاموں کا حکم دیتے رہے اور جاہلوں کی بات نہ سنو'' (۳: ۱۹۹)۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں ''انفاق بالعفو'' کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ زکوٰۃ کے حکم پر مستزاد ہے کیونکہ یہ آیت مدنی ہے اور زکوٰۃ کے حکم کے بعد نازل ہوئی ہے۔ حقانی صاحب اپنی رائے کی تائید میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی تحریریں بھی پیش کرتے ہیں۔

جناب ارشاد احمد حقانی کے یہ خیالات انقلابی ہیں اور معاشرے میں نفاذ اسلام کے لیے سرگرم کوئی قابل ذکر گروہ انہیں اختیار کرنے پر تیار نہیں۔ سب سے پہلے تملیک کے مسئلے ہی کو دیکھیے۔ سادہ لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ زکوٰۃ کسی متعین فرد کو دی جانی چاہیے۔ آج جو زکوٰۃ دینی مدارس کو دی جاتی ہے، وہ واضح ہے کہ اجتماعی مصارف کے لیے ہوتی ہے لیکن علماء ایک حیلے کے ذریعے اسے یوں جائز کرتے ہیں کہ اس زکوٰۃ کو کسی طالب علم کی ملک قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد پھر وہ حسب ضرورت اسے خرچ کرتے ہیں۔ علماء کو معلوم ہے کہ اس کی حیثیت ایک حیلے سے زیادہ نہیں لیکن وہ اس فقہی تعبیر پر نظر ثانی کے لیے آمادہ نہیں۔ کئی سال پہلے مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کے رد میں ایک مضمون ''مسئلہ تملیک'' کے عنوان سے لکھا جو ان کی کتاب ''تنقیدات'' میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے عقلی ونقلی دلائل سے اس موقف کو رد کرتے ہوئے زکوٰۃ کے مصارف کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ جناب جاوید احمد غامدی نے ''میزان'' میں اس کی مزید تفصیل کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اور عشر کو ریاست کسی بھی اجتماعی مفاد میں خرچ کر سکتی ہے۔

اسی طرح یہ سوال بھی علماء میں زیر بحث رہا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کیا زکوٰۃ کے علاوہ بھی لوگوں سے ان کا مال لے سکتی ہے۔ قدیم علما میں سے بہت سے لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ ریاست زکوٰۃ کے علاوہ بھی شہریوں پر ٹیکس عاید کرسکتی ہے۔ جناب جاوید احمد غامدی کا موقف یہ ہے کہ ریاست عوام کی مرضی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس قانوناً لینے کی مجاز نہیں ہے۔ اس کے لیے وہ سورہ توبہ کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے ''پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو'' (التوبہ ۹: ۵)۔ اس رائے کے تحت شرعی اعتبار سے اس معاملے کی قانونی نوعیت یہی ہے۔ تاہم اس پر گفتگو ہوسکتی ہے کہ عوامی مرضی کو جانچنے کا پیمانہ کیا ہے۔ یورپ میں ایک دور میں ریاست کے اس مطلق حق کو چیلنج کیا گیا کہ وہ عوام پر کوئی ٹیکس نافذ کرے (No taxation without representation) اس عہد کا ایک معروف نعرہ تھا اور اس کی پزیرائی جمہوری ریاست کی طرف ایک اہم قدم شمار ہوتا ہے۔ لوگوں کی مرضی کے بغیر اگر اس معاملے میں ریاست کا غیر مشروط حق تسلیم کرلیا جائے تو اس سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس کا تجربہ اشتراکی ریاستوں میں کیا جا چکا ہے۔ یہ اس معاملے کی قانونی اور اصولی تعبیر ہے۔ تاہم غیر معمولی حالات میں، ہمیں معلوم ہے کہ عمومی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جنگ، قحط اور قدرتی آفات جیسے ہنگامی حالات میں کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے اور اس کے لیے عام اخلاقیات کے پہلو سے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسے اقدامات کے لیے عمومی قوانین سے دلیل لائی جائے۔ اگر کسی معاشرے میں دولت کی تقسیم کا معاملہ غیر فطری اور انتہائی سطح پر غیر متوازن ہوجائے تو اسے بھی ہنگامی صورت حال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں فالتو شخصی مال پر ریاست کا تصرف جائز شمار کیا جاتا ہے۔ تاہم جناب حقانی صاحب نے سورہ بقرہ اور سورہ اعراف سے جو استدلال کیا ہے، ایک نقطہ نظر کے مطابق وہ غیر ضروری ہے اور قرآن مجید کا سیاق وسباق اسے قبول نہیں کرتا۔ حقانی صاحب نے سورہ اعراف (آیت ۱۹۹) کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے ''اے نبی لوگوں سے ضرورت سے زیادہ مال و دولت لے لو اور معروف کاموں کا حکم دیتے رہے اور جاہلوں کی بات نہ سنو''۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہے: ''درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو''۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ یہ ہے: ''اے نبی نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو'' (تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۱۱۰)۔ اس آیت کا سیاق وسباق، ترجمے ہی سے پوری طرح واضح ہے۔

''کہہ دو تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، میرے خلاف چالیں چل دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکوکاروں کی کارسازی فرماتا ہے اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو، نہ وہ تمھاری ہی مدد کرسکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کرسکتے ہیں اور اگر تم ان کو راہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا کچھ نہیں۔ درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تمھیں کوئی وسوسہ شیطانی لاحق ہونے لگے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے اور جاننے والا ہے''۔ اب ان آیات میں اگر آیت ۱۹۹ کا وہ ترجمہ رکھا جائے جو حقانی صاحب کر رہے ہیں تو سیاق وسباق کسی طرح اسے قبول نہیں کر رہا۔ اسی طرح سورہ بقرہ (آیت ۲۱۹، جس میں العفو کا ذکر ہے) کی تفسیر میں مولانا اصلاحی لکھتے ہیں: ''یہ سوالات ان کمزور قسم کے لوگوں کی طرف سے ہیں جو انفاق میں مشقت محسوس کر رہے تھے۔ ان کی اسی کمزوری کا لحاظ تھا کہ قرآن نے ان کو جواب بھی درجہ بدرجہ دیا تاکہ ان پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ دوا سے گھبرانے والے مریض کو اگر پوری خوراک ایک ہی مرتبہ میں نہ جاسکتی ہو تو تقاضائے حکمت یہی ہے کہ وہ دو تین مرتبہ میں دی جائے۔ چنانچہ انفاق کے متعلق بار بار سوال کرنے والوں کو بھی قرآن نے آخری اور فیصلہ کن جواب یہ تیسری مرتبہ میں دیا۔ یہ جواب اگر پہلی ہی مرتبہ میں دے دیا جاتا تو عجب نہیں کہ زیادہ کمزور قسم کے لوگوں کے ایمان کے لیے آزمائش بن جاتا۔

یہ جواب نہایت مختصر ہے مگر ساتھ ہی نہایت واضح اور قطعی ہے۔ فرمایا کہ قل العفو (جو فاضل بچے وہ خرچ کرو)۔ فاضل سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی اور اپنے بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچے وہ دے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لیے صدقات واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہے بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کا تعلق جہاد، اعلائے کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاع ملت سے ہے۔ ان مقاصد کے لیے ایک مسلمان پر انفاق کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کی یہ آخری حد بتادی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت کے لیے ضرورت پڑ جائے تو اپنی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچا سکو وہ سب اس جہاد میں قربان کردو۔ قومی زندگی میں ایسے حالات و واقعات بھی پیش آتے ہیں جب قوم و مذہب کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور دنیا کی ہر غیرت مند قوم خواہ کافر ہو یا مؤمن، یہ بازی کھیلنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اس قربانی و جاں بازی کے لیے اپنی خوشی سے تیار رہیں''۔ (تدبر قرآن، جلد اول، صفحہ ۵۱۶)

مولانا اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں مزید لکھتے ہیں:

’’عفو کے لفظ سے اشتراکی نظریات سے متاثر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ ناگزیر ضروریات سے فاضل آمدنی ایک اسلامی حکومت اجتماعی مقاصد کے لیے اپنے قبضے میں لے سکتی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادیٔ رائے سے اس حد تک ایثار کے لیے تیار رہیں۔ دوسرے یہ کہ اس چیز کا تعلق جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، عام حالات سے نہیں بلکہ ایمرجنسی کے حالات سے ہے جب ملت کے تحفظ کا سوال سامنے آن کھڑا ہو۔ ایسے حالات میں اول تو افراد خود ہی ہر طرح کی قربانیوں کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر حکومت کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ اگرچہ اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر ارادہ واختیار کی آزادی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیکی کا حوصلہ پیدا ہو۔ اسلام کی نظر میں اس آزادی کی جتنی قدر ہے، اتنی قدر مجبوری اور پابندی کی نیکی کی نہیں ہے‘‘۔

قرآن مجید کی ان آیات کی تفسیر و تفہیم کے حوالے سے میں نے دونوں آرا اور ان کے دلائل بیان کر دیے ہیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ نفاذ شریعت کے باب میں عامۃ الناس کی معاشی فلاح و بہبود کو مرکزیت حاصل ہے جسے اسلام قانون سازی اور ترغیب، دونوں طریقوں سے یقینی بنانا چاہتا ہے۔

جناب ارشاد احمد حقانی نفاذ اسلام کے تناظر میں، سیاسی حوالے سے جو اصلاحات تجویز کرتے ہیں، ان میں جمہوریت سب سے اہم ہے۔ جمہوریت کے بڑے بڑے اجزا ان کے نزدیک درج ذیل ہیں:

۱- ’’عوام سے موقت (مقررہ وقت پر) مینڈیٹ لینا
۲- منتخب اداروں کا دستور اور قانون کے مطابق کام کرنا اور انتظامیہ پر کڑی نظر رکھنا
۳- پارٹی وفاداری کا احترام اور فلور کراسنگ سے اجتناب
۴- کثیر کلچر، تحمل اور برداشت
۵- بااصول مستحکم سیاسی جماعتوں کی موجودگی اور ان کی داخلی جمہوریت
۶- تقسیم اختیارات یا تثلیث اختیارات کے اصول کا احترام‘‘ (صفحہ ۲۰)

جمہوریت کا تصور بنیادی طور پر سیکولرزم سے پھوٹا ہے اور اس میں قانون سازی کا حق عوام کے لیے خاص ہے۔ اس تناظر میں سیکولرزم کا مفہوم یہ ہے کہ ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہے اور وہ بطور ریاست کسی ایک مذہب کی پابند نہیں۔ جناب حقانی سیکولرزم کے اس تصور کو قبول نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’مجھے ان لوگوں پر حیرت ہے جو سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں اور یہ محض مادے کے ظہور وفنا کا ایک کھیل ہے۔ اسی طرح جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خالق ہے تو اب اس کا اس کائنات سے کوئی تعلق نہیں یا جو کہتے ہیں کہ خدا نے ہدایت نازل تو کی ہے لیکن صرف نجی زندگی سے متعلق۔ حیات اجتماعی کے بارے میں کوئی ہدایت نازل نہیں ہوئی اور اگر بالفرض نازل ہوئی بھی ہے تو اب

اگر آپ ایک عام مسلمان شہری سے یہ دریافت کریں کہ نفاذ شریعت کے سب سے پہلے جو اثرات مرتب ہونے چاہئیں، ان کے بارے میں تمہارے ذہن میں کیا تصور ہے تو وہ بلا تامل جواب دے گا کہ پاکستان میں انصاف (عدل) کا دور دورہ ہونا چاہیے۔

[متروک] obsolete ہو چکی ہے۔ میں ایسے خیالات رکھنے والے لوگوں کی عقل وفہم پر حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ انسان نے الہامی ہدایت کو سمجھنے میں بار بار غلطیاں کی ہیں۔ اس کو مسخ کیا ہے۔ غلط نتائج اخذ کیے ہیں۔ تو ضرورت اس بات کی ہوئی کہ الہامی ہدایت کے بارے میں غلط رویوں کی اصلاح کی جائے نہ کہ سرے سے اس کا انکار کر دیا جائے کہ وہ نازل ہی نہیں ہوئی‘‘۔ (صفحہ ۱۱۸)

حقانی صاحب مزید لکھتے ہیں:

’’میری یہ بھی رائے ہے کہ آج وسیع تر مفہوم میں فکر انسانی میں جو بھی صالح اور نافع عناصر ہیں، ان کا سرچشمہ کوئی نہ کوئی اور کسی نہ کسی دور کی الہامی ہدایت ہے، خواہ اس ہدایت کے اولین مخاطبین خود بھی اسے کیوں نہ بھول چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خاص مفہوم میں، میں وحدت ادیان کا قائل ہوں۔ اور اسی وجہ سے مختلف ادیان اور ان کے پیرو کاروں کے درمیان تصادم اور افتراق کو نہیں، تعاون واشتراک عمل کو فطری رویہ سمجھتا ہوں ہماری ٹریجڈی یہ نہیں ہے کہ ہم نے اسلام کا نام لے کر غلطی کی بلکہ ٹریجڈی یہ ہے کہ یہ نام غلط انداز اور غلط مفہوم میں لیا۔ اگر اسے صحیح انداز میں لیا ہوتا یا اب لیا جائے تو پاکستان ایک صحت مند اور ترقی یافتہ معاشرہ بن سکتا ہے۔ یہ رائے کہ اسلام صرف بندے اور خدا کے درمیان ایک نجی تعلق ہے، بدیہی طور پر ایک جزوی صداقت ہے۔ آخر انسان کی حیات اجتماعی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ جن امور پر اسلامی احکام اور اوامر و نواہی موجود ہیں یعنی بقول جسٹس منیر جو covered area ہے وہ محدود ہے۔ بقیہ ایریا

اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور بقول اقبال اجتہاد کا اہم ترین مآخذ اجماع ہے۔ دوسرے لفظوں میں وقت کے مسلم اہل علم یا ان کا مرکز ملت دین کے کسی خاص حکم کی جس تشریح پر متفق ہوں، وہ واجب الاطاعت ہوگی''۔

اپنے اسی کالم میں وہ اپنے فہم دین کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

''میں حی غیر متلو کا قائل نہیں ہوں اور نہ قرآن میں ناسخ ومنسوخ کے نظریے کو درست سمجھتا ہوں۔ اندریں حالات اب تو ہمارے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو ایک روشن خیال نظام زندگی کے طور پر سمجھیں اور اسے اپنانے کا راستہ اختیار کریں۔ مذہبی نعرہ بازی ترک کریں، حکمران بھی اور مولوی بھی اور پاکستان کو ایک ایسی مملکت بنادیں جو اس ملک کے عوام کو محرومیوں، ظلم، استحصال، بیماری، بھوک، بیروزگاری، پسماندگی، ناخواندگی سے نجات دے سکے اور یہاں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو اسلام اور جدیدیت کا ایک حسین امتزاج ہو۔ میں نے جدیدت کا لفظ بات کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیا ہے ورنہ میرا جو فہم اسلام ہے اس کو واضح کرنے کے لیے جدیدیت کی اصطلاح کا استعمال غیر ضروری ہے...... انسان کی معاشرتی اور نجی وروحانی زندگی کے لیے اسلام جو راہنمائی دیتا ہے، اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی دوسرا فلسفہ زندگی اور نظام تہذیب نہیں کرسکتا'' (صفحہ ۱۲۰)۔

یہاں حقانی صاحب نے اپنے جس فہم اسلام کو بیان کیا ہے اور اس کے لیے جن اصطلاحوں کا سہارا لیا ہے، اس سے جناب غلام احمد پرویز کے خیالات سے مطابقت بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ پرویز صاحب بھی ان مسائل پر کم وبیش یہی رائے رکھتے ہیں۔ یہ مطابقت العفو کے مفہوم کے تعین اور معاشی امور میں ریاستی اختیارات کے باب میں بھی پائی جاتی ہے۔ اہل علم کے نتائج فکر میں یکسانیت علمی دنیا میں کوئی اجنبی بات نہیں تاہم بالعموم یہ یکسانیت جزوی ہوتی ہے، کلی نہیں اور کسی ایک صاحب علم کے ساتھ خاص نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر وہ □"ایک مفہوم" میں مولانا مودودی کے تصور تھیوڈیموکریسی کی بھی تائید کرتے ہیں۔ (صفحہ ۱۸۸)

نفاذ شریعت کے باب میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ شریعت کی تعبیر وتشریح کا اختیار کسے دیا جائے۔ جناب ارشاد احمد حقانی نے اس سوال کو بھی اپنے کالموں کا موضوع بنایا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس کے اسباب کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس اختلاف یا بحث کے ڈانڈے اصل میں تھیوکریسی اور ڈیموکریسی کے فرق اور تصادم کی بحث سے جا ملتے ہیں۔ ہم چونکہ ان دونوں کے درمیان کوئی شکل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے مذکورہ نوعیت کے اختلافات ہمارے ہاں پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ کہنے کو تو یہ بات بڑی آسان ہے کہ اسلام میں حاکمیت جمہور کا حق نہیں نیز یہ کہ پاکستان میں کوئی قانون سازی کتاب وسنت کے منافی نہیں ہوسکتی اور کتاب وسنت کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اور انہیں نظر انداز کرتے ہوئے مسلمانوں کی منتخب مقنّنہ قانونی سازی کی مجاز ہے لیکن الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کسی خاص مسئلے میں اسلام کا حکم کیا ہے اور اس کا نفاذ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ یہاں آ کر علما اور دنیاوی قانون سازوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوجاتا ہے''۔

حقانی صاحب کا تجزیہ یہ ہے کہ یہ فرق دراصل مسائل حیات کے باب میں نقطہ نظر کا فرق ہے اور اس کا دائرہ خواتین کے سماجی مقام سے لے کر معاشی ومعاشرتی اصلاحات تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کا اپنا نقطۂ نظر تو یہی ہے کہ تعبیر شریعت کا حل اس انقلابی فکر پر مبنی ہونا چاہیے جس کے خدوخال انہوں نے بیان کیے ہیں اور جن کا تذکرہ سطور بالا میں ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے رجحانات کا بھی ذکر کیا ہے کہ مسلمان اہل علم کی اکثریت یا مرکز ملت کسی دینی حکم کی جس تعبیر پر متفق ہو، وہ نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں وہ پارلیمنٹ کے حق اجتہاد پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے باب میں مصنف کا ایک واضح موقف اور سوچی سمجھی رائے ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے جن امور کو بنیادی اہمیت دی ہے، ان کو نظر انداز کر کے ہم ایک اسلامی معاشرے کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے نتائج فکر سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ جو ریاست یا معاشرہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور معاشی استحصال کا مظہر ہو اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے اسلامی تشخص کا دعویٰ کرے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ ہمیں اگر پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا ہے تو اسلام کو بنیاد مان کر ہمیں اس تہذیبی ارتقا کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو ریاست اور ریاستی اداروں کے حوالے سے واقع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک فرد واحد نے نفاذ شریعت کے مسئلے پر جس طرح ایک ہمہ جہتی سوچ کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی کوئی مثال، ہماری مذہبی سیاسی جماعتیں، الا ماشاء اللہ، اجتماعی طور پر بھی پیش نہیں کرسکیں۔

کتاب .... دین وسیاست

سال اشاعت 2000

مصنف .... ارشاد احمد حقانی

ناشر .... فیروزسنز لمیٹڈ

ہیڈ آفس 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور